منتخب نصاب (درس ۲۶)

ڈاکٹر اسرار احمد

اُمتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت

اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید

(۱۴)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطٰمًا ؕ وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ؕ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىکُمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝﴾ (آیات ۲۰ تا ۲۴) ......صدق اللّٰہ العظیم

دنیا کی زندگی کس اعتبار سے کھیل تماشا ہے؟

سورۃ الحدید کا یہ پانچواں حصہ بھی پانچ آیات پر مشتمل ہے اور اس کی سب سے پہلی آیت بھی میرے نزدیک قرآن کریم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ میرے مشاہدے کی حد تک اس آیت کی بھی اصل حقیقت تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہو سکی ہے۔ اس لئے کہ یہاں پانچ الفاظ جس حسنِ ترتیب کے ساتھ آئے ہیں اس میں ایک بہت بڑی حکمت مضمر ہے جس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ یہ مضمون کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے اور دھوکے کی ٹٹی ہے' یہ اس اعتبار سے ہے کہ اگر دنیا خود مطلوب و مقصود بن جائے اور آخرت سے غافل کر دے۔ چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ ''دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں''۔ کوئی شخص اگر غریب الوطنی کی کیفیت یعنی حالت مسافرت میں ہو اور اپنا اصل گھر' اصل وطن اور اصل منزل بھول جائے تو معلوم ہوا کہ وہ بہت ہی بدنصیب شخص ہے۔ تو دنیا اگر اس طریقے سے کسی انسان کو اپنے اندر جذب کر لے' متوجہ کر لے کہ اس کی اصل زندگی پس پردہ چلی جائے تو اس اعتبار سے دنیا کی زندگی سراسر دھوکے کا سامان ہے۔ اس مضمون کو سورۃ العنکبوت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۶۴)

''یہ دنیا کی زندگی تو کھیل کود اور تماشے کے سوا کچھ نہیں' اصل زندگی تو آخرت کے گھر کی زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا۔''

تو اگر حیاتِ دُنیوی انسان کو آخرت سے غافل کر دے تو اس سے بڑا دھوکے کا سامان کوئی نہیں۔ اس معنی میں بہت سی جگہوں پر قرآن مجید میں یہ مضمون آیا ہے' بلکہ ''لَهْوٌ وَّلَعِبٌ'' اور ''لَعِبٌ وَّلَهْوٌ'' دونوں ترکیبوں کے ساتھ آیا ہے' لیکن جس شان سے یہاں سورۃ الحدید میں آیا ہے اور پھر اس پر جو اضافہ ہے' میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ یہ قلت تدبر ہی ہے کہ اس پر لوگوں نے غور ہی نہیں کیا کہ یہ الفاظ کس ربط کے ساتھ آ

رہے ہیں۔فرمایا: ﴿اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ﴾ ان الفاظ کی ترجمانی یوں ہوگی کہ ''جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی تو بس یہی کچھ ہے کہ کھیل ہے' کچھ لذت حاصل کرنا ہے' کچھ زینت اور بناؤ سنگھار ہے' کچھ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے اور کچھ مال اور اولاد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش ہے''۔ یہ پانچ الفاظ جو یہاں آئے ہیں ان کو اسی ترتیب سے رکھ کر یہ مضمون بیان کیا جا سکتا ہے۔لیکن ان کی جو اصل عظمت ہے وہ اس حوالے سے ہے کہ یہ اصل میں حیاتِ انسانی کے پانچ ادوار ہیں جو اِس ترتیب سے آئے ہیں۔ ہمارے اردو یا عربی کے محاورے میں عام طور پر ''لہو ولعب'' کا لفظ آتا ہے' لیکن یہاں پر ''لَعِبٌ وَّلَھْوٌ'' کی ترکیب آئی ہے' تو یہ ویسے ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حکمت کی حامل ہے!

انسانی زندگی کے پانچ ادوار ـــــ آئینۂ قرآنی میں

انسانی زندگی کے پانچ ادوار ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جبکہ زندگی صرف کھیل سے عبارت ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں کوئی فکر' تشویش اور اندیشہ نہیں' اپنے کھانے پینے کی بھی فکر نہیں' وہ والدین کے ذمہ ہے' بھوک لگے گی تو ماں کھلائے گی' پلائے گی۔ بچے کے لئے زندگی صرف کھیل ہے۔ اِلّا یہ کہ تکلیف ہوگی تو وہ رولے گا' کوئی احتیاج ہوگی تو مُنہ بسورے گا اور والدین کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ باقی اس کو کسی اور شے کی کوئی فکر نہیں۔ یہ کھیل ابھی خالص معصومانہ کھیل ہوتا ہے' اس میں کوئی تلذّذ کا عنصر نہیں ہوتا۔ بچے کی سوچ اور سارے کے سارے فکر کا مرکز کھیل (لعب) ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: ﴿اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ......﴾

اس کے بعد ایک سٹیج آتی ہے جسے ''teen ager stage'' کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا نہایت خطرناک دور ہوتا ہے۔ اب یہاں کھیل صرف کھیل نہیں رہ جاتا' اس میں کچھ نہ کچھ تلذّذ (sensual gratification) شامل ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں آدمی بہت سی غلط قسم کی آوارگیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ ''لَھْو'' ہے

جو ''لَعِب'' کے بعد ہے۔

تیسری سٹیج ہے ''زِیْنَۃٌ'' یعنی بناؤ سنگھار۔ اٹھارہ سے بیس برس کے نوجوانوں اور خاص طور پر لڑکیوں کے ذہن پر جو چیز سب سے زیادہ سوار ہوتی ہے وہ فیشن ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لباس اور وضع قطع بالکل فیشن کے مطابق ہوں۔ اگر تنگ موری والی پینٹ کا رواج ہے تو کوئی نوجوان چوڑی موری والی پینٹ پہننے کو ہرگز تیار نہیں ہوگا اور اس کے برعکس چوڑے قسم کے پائنچوں والی پتلون کا رواج ہے تو وہ دوسری قسم کی پتلون نہیں پہنے گا۔ گویا کہ ان کے سارے سوچ وفکر' احساسات اور نفسیات کے اندر سب سے نمایاں شے یہی بناؤ سنگھار اور زینت ہوتی ہے۔

اس کے بعد چوتھا دور آتا ہے ''تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ'' کا۔ یہ دور دراصل ۲۵ سال کی عمر سے لے کر ۳۵ یا ۴۰ سال کی عمر تک کا دور ہے۔ اس میں اصل شے تفاخر ہے کہ انسان فخر میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ فخر مختلف چیزوں پر ہوتا ہے۔ فخر علم پر بھی ہوسکتا ہے' اپنے زہد وعبادت گزاری پر بھی ہوسکتا ہے اور مال ودولت پر بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے پٹھانوں کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ اگر مدمقابل کے گھر پر نئے ماڈل کی کار آ گئی ہے تو پٹھان چاہے اپنی زمین گروی رکھے یا کچھ اور کرے بہرحال اسی ماڈل یا اس سے بہتر قسم کی کار جب تک اس کے دروازے پر نہیں آئے گی اسے چین نہیں آئے گا۔ اسی طرح اپنی نسل اور عصبیت پر بھی فخر ہوسکتا ہے۔ یعنی اپنی قبائلی برتری کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ ''تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ'' کا دور ہے۔

چالیس برس کے بعد جب عمر ڈھلنی شروع ہوتی ہے تو ''تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' والا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اب انسان کو کثرت کی فکر ہو جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع ہو جائے' بلکہ میں یہ الفاظ استعمال کیا کرتا ہوں کہ ''تفاخر'' کے دور میں تو آدمی مونچھ اونچی رکھتا ہے' چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ مونچھ نیچی نہیں ہونے دیتا' لیکن ''تکاثر'' کے دور میں آدمی سوچتا ہے کہ مونچھ چاہے مونڈ بھی دی جائے لیکن پیسہ ملے۔ اس کے پیش نظر اصل شے پیسہ اور دولت ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح اس کے

پاس آ جائے‘ چاہے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔ آدمی اس دور میں گویا بڑا حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے کہ اب بناؤ سنگھار اور تفاخر جیسی چیزوں پر کیوں خواہ مخواہ اپنی دولت ضائع کی جائے۔ بس پیسہ سنبھالو اور دولت سینت سینت کر رکھو!

یہاں قرآن مجید میں کثرت کی خواہش میں اولاد کا ذکر بھی موجود ہے۔ آج میڈیا کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے زیر اثر کثرتِ اولاد کو باعثِ عار سمجھا جانے لگا ہے‘ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کثرتِ اولاد ہمیشہ فخر کی علامت رہی ہے۔ خاص طور پر جس کے جوان بیٹے ہوں اس کو یقیناً ایک تقویت حاصل ہوتی ہے۔ قبائلی زندگی میں تو دراصل انسان کی ذاتی عزت و وجاہت اسی بنیاد پر تھی۔ آج بھی دیہاتی زندگی میں یہ عنصر موجود ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر سلیم صاحب‘ جو ایک ڈاکے میں قتل کر دیے گئے تھے‘ مثال دیا کرتے تھے کہ باجوہ فیملی کے ایک شخص کے‘ جو فیصل آباد کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا‘ گیارہ بیٹے تھے جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے۔ کوئی کہیں پر ڈی سی لگ گیا‘ کوئی کسی اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گیا‘ جبکہ گاؤں میں کوئی بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ وہاں پر تو اس کا مقابلہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا اور وہاں اس کے پاس کوئی بھی بیٹا نہیں تھا جو اُس کا دست و بازو بنتا اور اس کی طرف سے مدافعت کرتا۔ تو وہ کہا کرتا تھا کہ کوئی میرے گیارہ پڑھے ہوئے لے لے اور مجھے ایک اَن پڑھ دے دے۔ اس لئے کہ یہاں پر تو جس کے پاس لاٹھی ہے اس کی عزت ہے‘ گاؤں میں تو سر اٹھا کر وہی چل سکتا ہے جس کے جوان بیٹے اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں اور میرے بیٹے تو پڑھ لکھ کر سب کے سب چلے گئے‘ لہٰذا میرے لئے عزت و وجاہت کی کوئی بنیاد موجود نہیں[1]۔ یہاں خاص طور پر نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید خاص قبائلی پس منظر میں نازل ہو رہا تھا اور اس کے اوّلین مخاطب وہی تھے جن کا سارا نظام قبائلی تھا۔ آج کی دنیا میں تو ضبطِ تولید اور فیملی پلاننگ کا معاملہ ہے‘ لیکن فطرت سے

(۱) پنجابی زبان کا مشہور محاورہ ہے: ”ویراں بانجھ نہ جوڑیاں تے پتراں بانجھ نہ مان!“ یعنی بھائیوں کے بغیر جوڑی (جتھہ بندی) نہیں بنتی اور بیٹوں کے بغیر فخر کی کوئی بنیاد نہیں۔ (مرتب)

قریب تر جو معاشرہ ہوتا تھا' اوراب بھی جو ہوگا وہاں کثرت کی محبت میں مال کے ساتھ اولاد بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ چنانچہ ہمارے دیہاتوں کے اندراب بھی ''تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔

درحقیقت ان پانچ الفاظ کے مابین جو ربط ہے وہ بڑا اہم اور حکمت پر مبنی ہے۔ اصل بات جو بتائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی تو لامحالہ ان ادوار میں سے ہو کر گزرے گی۔ بچپن بھی آئے گا' نو جوانی کا دور بھی آئے گا' جوانی اور بڑی قوت والی زندگی کا دور بھی آئے گا۔ پھر ادھیڑ عمر کے مرحلے کو بھی انسان پہنچے گا اور اسے بڑھاپا بھی آ کر رہے گا۔ ان مراحل میں سے کسی کو بھی انسان روک نہیں سکتا۔ یہ تو گویا وقت کی رفتار ہے' جس کا روکنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اب آخرت سے اس کا تقابل کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿ وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ ﴾ ''اور آخرت میں یا تو سخت عذاب ہے اور یا پھر اللہ کی مغفرت اور خوشنودی ہے''۔ آخرت کی زندگی میں ابدی طور پر نوع انسانی کے دو حصے ہو جائیں گے' یا اللہ کی طرف سے رضوان اور مغفرت ہوگی یا شدید عذاب ہوگا۔ ﴿ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ ﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں''۔ یہ دنیا کی زندگی کہیں تمہیں اپنے اندر گم نہ کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کو ہی مطلوب و مقصود سمجھ بیٹھو۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

دُنیوی زندگی بھرپور طریقے سے گزارنی ہے لیکن ع ''بازار سے گزرا ہوں' خریدار نہیں ہوں!'' کے مصداق اس کو مطلوب و مقصود نہیں سمجھنا۔ ایک حدیث نبویؐ ہے: ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ))[1] ''دنیا میں اس انداز سے رہو

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ: کُن فی الدُّنیا ...... وسنن الترمذی' کتاب الزهد' باب ما جاء فی قصر الامل

گویا کہ اجنبی (غریب الوطن) ہو یا راہ چلتے مسافر۔'' یہ بات سامنے رہے کہ یہ تمہارا گھر اور منزل نہیں ہے' یہاں تمہیں ہمیشہ نہیں رہنا' تم راہ چلتے مسافر ہو۔ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ سخت قسم کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے جس سے آپؐ کی پیٹھ مبارک پر نشان پڑ گئے تھے۔ کسی صحابیؓ نے عرض کیا کہ حضور (ﷺ)! آپ کے لئے آرام دہ بستر کا انتظام نہ کرلیا جائے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا' مَا اَنَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَهَا))[1] ''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میں تو اس دنیا میں بس اس طرح ہوں جیسے کوئی سوار (گھوڑ سوار یا اونٹنی پر سوار) کسی درخت کے سائے میں رُکتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے آرام کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے (اور اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے)''۔ وہ درخت اس کا گھر' وطن اور منزل نہیں ہے' وہ اسے چھوڑ کر اپنا راستہ لیتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا کو بس اتنی سی دیر کے لئے قیام گاہ سمجھو' اس سے زیادہ نہیں۔

ایک بات اور نوٹ کیجئے کہ یہاں جو پانچویں چیز ''تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ'' بیان کی گئی ہے' اس کی وضاحت یا تکمیل سورۃ التکاثر میں بایں الفاظ ہو رہی ہے: ﴿اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۝ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾ ''تمہیں کثرت کی محبت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ تم قبروں تک جا پہنچے''۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ انسان کے پاس چاہے دولت کے انبار ہوں اور اتنی دولت ہو کہ کئی نسلوں کے بارے میں اطمینان ہو کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اسے کھا سکتی ہیں' لیکن پھر بھی دولت کی بہتات کی طلب ختم نہیں ہوتی۔ صاف نظر آ رہا ہوتا ہے کہ ایک شخص قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے' لیکن دولت کی حرص ختم نہیں ہوتی۔ تو یہی وہ کیفیت ہے جسے تکاثر سے موسوم کیا گیا ہے۔

نباتاتی سائیکل اور اس کی حیاتِ انسانی سے مماثلت

حیاتِ انسانی کے متذکرہ بالا پانچ ادوار کے بعد ایک بڑی پیاری تمثیل آ رہی

(۱) سنن الترمذی' کتاب الزھد' باب ما جاء فی اخذ المال بحقہ۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب مثل الدنیا

ہے۔فرمایا:﴿ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا ؕ ﴾ ''اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے' پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی' پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے''۔جس طرح انسانی زندگی کا سائیکل ہے کہ بچپن ہے' پھر نوجوانی ہے' پھر پوری طاقت اور شدت کو پہنچنا ہے' اس کے بعد ادھیڑ عمر اور پھر بڑھاپا ہے' اسی طرح ایک نباتاتی سائیکل چل رہا ہے۔﴿ کَمَثَلِ غَیْثٍ ﴾ ''جیسے مثال ہے بارش کی''۔﴿ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ﴾ ''کاشت کاروں کو اس کی نباتات بھلی لگیں''۔''کفر'' کے لغوی معنی ہیں دبا دینا' چھپا دینا اور مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ یہاں ''کفار'' سے مراد وہ اصطلاحی کافر نہیں ہیں جو اللہ یا اس کے رسولؐ یا آخرت یا قرآن کا انکار کریں' بلکہ یہاں کفار سے مراد کاشت کار ہیں۔اس لئے کہ کاشت کار بھی زمین میں بیج کو دباتا ہے کہ پھر وہاں سے کھیتی ابھرے گی اور لہلہائے گی۔سورۃ الفتح کے اخیر میں کاشت کار کے لئے ''زُرَّاع'' کا لفظ آیا ہے ﴿یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ ﴾ جب بارش ہوتی ہے تو کھیتی اپنی سوئی نکالتی ہے' چھوٹی چھوٹی پتیاں نمودار ہوتی ہیں تو کاشتکار کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

﴿ ثُمَّ یَھِیْجُ ﴾ ''پھر وہ کھیتی اپنی پوری قوت پر آتی ہے''۔ ھَاجَ' یَھِیْجُ کسی چیز کے بھڑکنے' برانگیختہ ہونے اور جوش مارنے کے لئے آتا ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے ''ھَاجَ الدَّمُ'' (خون نے جوش مارا) اور ''ھَاجَ الْفَحْلُ'' (نر اونٹ جوش میں آیا' بپھر گیا)۔ اسی سے باب تفعیل میں ھَیَّجَ' یُھَیِّجُ' تَھْیِیْجًا آتا ہے' جس کا مطلب ہے کسی شے کو جوش دلانا۔اور ''ہیجان'' کا لفظ تو اردو میں بھی مستعمل ہے۔تو فرمایا جا رہا ہے کہ بارش ہوئی تھی تو اب بے آب و گیاہ مٹی میں سبزہ نمودار ہو گیا ہے۔پھر وہ فصل لہلہاتی ہے' پوری قوت کو آتی ہے' جوش مارتی ہے۔آگے فرمایا:﴿فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا﴾ ''پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئی''۔کچھ عرصے کے بعد اب وہ فصل یا گھاس زرد پڑ جائے گی۔بالفرض گیہوں کی فصل ہے تو شروع میں تو بڑا ہریالی کا منظر نظر آتا ہے' لیکن جب فصل پکنے پر

آتی ہے تو وہ زرد پڑ جاتی ہے۔ ﴿ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ﴾ ’’پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے‘‘۔ اب اگر فصل ہو تب بھی وہ کٹنے کے بعد بھس بن جاتی ہے اور اگر چراگاہ ہو تب بھی اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ چراگاہیں بھی بڑے بڑے رقبوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پورے وسطی ایشیا کے جو ہموار علاقے ہیں ان کے بڑے بڑے رقبے چراگاہوں پر مشتمل ہیں۔ یہ سطح مرتفع کی ڈھلوانیں ہوتی ہیں جن پر سب سے زیادہ قوی لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ منگولز بھی سطح مرتفع کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر جو مرہٹے پائے جاتے ہیں وہ بھی سطح مرتفع دکن کے لوگ ہیں۔ ان کے ہاں یہی ہوتا تھا کہ بارش کے بعد سبزہ اُگ آتا تو اب ان کے جانور وہاں چرتے پھر رہے ہوتے اور یہ خود گھوڑوں پر سوار ہو کر پھر رہے ہوتے۔ یہی قبائل تھے کہ جب گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو پھر دنیا میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' وہ اٹیلا ہو یا چنگیز ہو۔ چنگیز کہاں سے چل کر کہاں پہنچا ہے! یہ تمام تاریخی حقائق ایچ جی ویلز نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں۔

بہرحال یہاں پر یہ دیکھئے کہ اس کے بعد وہ سبزہ بھی کچھ عرصہ کے بعد دھوپ کی وجہ سے جل جائے گا' زرد ہو جائے گا' پھر وہ بھر بھرا سا ہو کر پاؤں تلے روندا جائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے گا' اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوگا۔ گویا وہ سبزہ' ہریالی اور تر و تازگی ختم ہوئی' اور معلوم ہوا کہ وہی سبزہ اب خاک بن کر اڑ رہا ہے۔ اب وہاں پھر وہی ویرانی ہے اور ریگزار کا ایک منظر ہے۔ چونکہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطبین عرب تھے لہٰذا یہ عرب کا پورا کا پورا پس منظر واضح ہو گیا۔ تو جیسے اس دنیا میں چند مہینوں کا نباتاتی سائیکل ہے کہ باقاعدہ بیج ڈالا' فصل تیار ہوئی' اب کٹنے کے بعد اُس کے تنکے ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں' بعینہٖ انسانی زندگی کا ایک سائیکل ہے۔ جس گھر میں بھی کوئی نئی ولادت ہوتی ہے' بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ہیں۔ پھر وہ بچہ بڑا ہوتا ہے' پھر اس میں طاقت آتی ہے' وہ جوانی کو پہنچتا ہے' اب اس کی امنگیں ہیں' اس کے ولولے ہیں۔ اس میں تفاخر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کی ایک ڈھلوان آتی ہے۔ اب چہرے پر بھی زردی آتی ہے' چہرے پر جھریاں پڑ رہی ہیں' بال

اب سیاہ نہیں رہے بلکہ سفید ہو رہے ہیں۔ آخر کار بڑھاپا آتا ہے' پھر موت آتی ہے اور وہ قبر میں اتار دیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد مٹی ہو کر مٹی میں مل جاتا ہے۔

نباتاتی سائیکل (Botanical Cycle) اور انسانی زندگی کا سائیکل (Human life Cycle) دونوں میں بڑی گہری مناسبت ہے' اور اس آیت کریمہ کا جو اصل معنوی حسن ہے وہ اسی میں مضمر ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مختلف مراحل ہیں جن سے ہر کسی کو گزرنا ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ ہونا ہے' بادشاہ کے ساتھ بھی ہونا ہے اور فقیر کے ساتھ بھی۔ محلوں میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ہونا ہے اور جھونپڑیوں والوں کے ساتھ بھی۔ فقیروں اور گداگروں کی زندگی بھی بالآخر ختم ہوگی' وہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہوں گے اور بادشاہوں اور محلات میں رہنے والوں کی زندگی بھی ختم ہوگی اور یہ بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے۔

لیکن آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ﴾ ''اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور (یا پھر) اللہ کی رحمت اور رضامندی ہے''۔ آخرت میں دوام اور مستقل زندگی ہے۔ وہاں یا تو عذاب ہے بہت سخت اور یا پھر دوسری شکل ہے کہ اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضا ہے۔ ﴿وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝﴾ ''اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کے سامان کے کچھ نہیں ہے''۔ البتہ یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے رہے کہ دنیا اس اعتبار سے تو دھوکے کا سامان ہے اگر یہ آپ کو آخرت سے غافل کر دے' لیکن اگر خوش قسمتی سے آخرت آپ کی منزل و مقصود کے طور پر مستحضر رہے تو دنیا کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے' اس لئے کہ اسی سے آخرت بنانی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ)) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ یہاں اگر بویا ہی کچھ نہیں تو وہاں کاٹو گے کیا! فصل کہاں سے ملے گی؟ اس اعتبار سے زندگی بہت قیمتی شے ہے۔ یہ liability نہیں ہے' بہت بڑا اثاثہ ہے' لیکن اس حوالے سے کہ اگر آخرت سامنے رہے اور مقصود و مطلوب وہی ہو۔ اور اگر اس دنیا نے انسان کو غافل کر دیا' اپنے اندر گم

کرلیا تو پھر یہ دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔ مؤمنوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ رہتے تو اس دُنیا میں ہیں' لیکن دنیا کے باسی نہیں ہیں' دنیا کے طالب نہیں ہیں' دنیا ان کے علم کا مبلغ نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہماری منزل تو آخرت ہے' ہم وہاں جا رہے ہیں۔ یہ تو ایک عارضی سفر ہے' عارضی قیام گاہ ہے۔ اگر یہ کیفیت ہے تو دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے' اس سے اگر صحیح استفادہ کیا جائے تو اسے ''امر'' بنایا جا سکتا ہے۔

مسابقت الی الجنّۃ کی دعوت

اب اگر یہ حقیقت واضح ہو گئی تو فرمایا: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین جیسی ہے''۔ ''سَابِقُوْا'' باب مفاعلہ سے ہے جس کا مطلب ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا۔ یہ لفظ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ تم دنیا کے طالب بن جاتے ہو تو دنیا میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ ﴿تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾ والا نقشہ ہوتا ہے۔ اب اگر آخرت منزل مقصود بن گئی تو اس کے لئے بھی دوڑ لگاؤ۔ اس کے لئے بھی ایک دوسرے سے آگے نکلو۔ یہ نہ ہو کہ دنیا کے لئے تو تمہارے اندر جوش و خروش اور حرکت ہے' مگر آخرت کہنے کی حد تک تو مطلوب و مقصود ہے' لیکن اس کی طرف سے بڑی قناعت ہے' اس کے لئے کوئی بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں ہے۔ مسابقت کا جذبہ فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ ایڈلر نے کہا ہے کہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش (The urge to dominate) ایک فطری جذبہ ہے۔ انسان کے اندر مسابقت کا جذبہ موجود ہے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ اس کے میدانِ کار کو بدل دیجئے۔ مسابقت مال و دولت میں نہ کیجئے' بلکہ خیرات میں کیجئے۔ سورۃ البقرۃ میں بھی یہ مضمون آیا ہے: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ''ہر ایک شخص کا کوئی نہ کوئی ہدف مقرر ہے جس کی طرف وہ پیش قدمی کر رہا ہے' تو (اے

مسلمانو!)تم نیکیوں کے لئے مسابقت کرو!'' تمہاری مسابقت اور استباق کا مرکز خیرات وحسنات' نیکیاں' بھلائیاں اور انصاف ہو۔تم جہاد فی سبیل اللہ میں آگے سے آگے بڑھ کر سرفروشی کرو' ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔تو دین کے معاملے میں یہ مسابقت ناپسندیدہ شے نہیں ہے' بلکہ قابل تعریف ہے۔

اس مسابقت کی مثالیں ہمیں صحابہ کرام ﷺ میں ملتی ہیں۔حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ دین کے لئے بڑا کڑا وقت آ گیا ہے' اب جو کچھ بھی لا سکتے ہو لاؤ' پیسے اور مال کی اشد ضرورت ہے' اس لئے کہ اسلحہ فراہم کرنا ہے' سواریوں اور زادِ راہ کا بندوبست کرنا ہے' تو اتفاقاً اُس وقت میرے پاس بہت دولت تھی۔[''اتفاقاً'' کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ مہاجرین سب کے سب تاجر تھے اور تاجر کے پاس کبھی کبھار ہی نقد رقم موجود ہوتی ہے' ورنہ تو سارا مال تجارت میں ہی invest رہتا ہے۔] حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ اس موقع پر تو میں حضرت ابوبکر ﷺ سے بازی لے ہی جاؤں گا۔ میں نے اپنے سارے اثاثے کے دو حصے کیے اور ایک حصہ لا کر حضور ﷺ کے قدموں میں حاضر کر دیا۔لیکن حضرت ابوبکر ﷺ جو کچھ لائے تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ عرض کیا کچھ نہیں چھوڑا' جو کچھ تھا لے آیا ہوں۔ ع ''صِدّیق ؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس!''۔تو حضرت عمر ﷺ فرماتے ہیں اُس روز میں نے جان لیا کہ ابوبکر صدیق ﷺ سے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔نوٹ کر لیجئے یہاں پر کمیت (Quantity) کا اعتبار نہیں ہے۔حضرت ابوبکر صدیق ﷺ اپنے گھر کا کُل کا کُل مال لے آئے اور حضرت عمر ﷺ اپنے سارے مال کا نصف لے آئے۔یہاں یہ تفصیل زیر بحث نہیں کہ کمیت کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کا مال کتنا تھا اور حضرت عمر ﷺ کا مال کتنا تھا۔لیکن کیفیت کے اعتبار سے حضرت صدیق اکبرؓ حضرت عمرؓ سے آگے بڑھ گئے' اس لئے کہ نصف تو بہر حال نصف ہوتا ہے' وہ کُل کے برابر تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔بہر حال اس تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ کرام ﷺ میں بھی

مسابقت کا جذبہ تھا جو اِس واقعہ سے ظاہر ہو رہا ہے' لیکن وہ مسابقت فی الخیرات تھی۔ لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس ضمن میں نہایت سنہرا اصول یہ ہے کہ: ''دنیا کے معاملے میں اس کو دیکھا کرو جو تم سے پیچھے ہو' اور دین کے معاملے میں اس پر نگاہ رکھو جو تم سے آگے ہو''۔ اس لئے کہ دین میں اپنے سے آگے والے کو دیکھنے سے دل میں عمل کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرے گا کہ یہ آدمی اگر اتنا کچھ کر رہا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں' وہ بھی تو میری طرح کا انسان ہے۔ اور جو دین میں خود سے پیچھے ہے اس کو دیکھنے سے آدمی سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں بہت ہے' اس لئے کہ اس نے تو یہ بھی نہیں کیا' تو اس سے دین میں ترقی رک جائے گی۔ اس کے برعکس دنیا داری میں آگے والے کو دیکھنے سے جذبہ ابھرے گا کہ آپ دنیا کمانے کے لئے مزید محنت کریں اور پیچھے والے کو دیکھنے سے قناعت پیدا ہو گی کہ آخر اس کا بھی تو ان آسائشات کے بغیر گزارا ہو رہا ہے' آخر وہ بھی تو اسی دنیا میں رہ رہا ہے' تو اتنی محنت کر کے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو دنیا کے لئے قناعت چاہئے۔ جیسا کہ مرزا عبدالقادر بیدل کا بڑا پیارا شعر ہے ۔

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ در کارِ حیات　　آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست!

یعنی اے بیدلؔ! یہ تو محض ہماری حرص ہے کہ ہمارے پاس یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو' یہ بھی ضروری ہے اور وہ بھی ضروری ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو زندگی گزارنے کے لئے لازمی سمجھتے ہیں ان میں اکثریت ایسی چیزوں کی ہے کہ جو حقیقت میں درکار نہیں ہوتیں۔ تو دنیا میں اس کو دیکھو جو تم سے پیچھے ہے' تا کہ جو بھی تمہیں حاصل ہے اس پر قناعت پیدا ہو اور اللہ کے شکر کا جذبہ ابھرے۔ اور دین میں اس کو دیکھو جو تم سے آگے ہے' تا کہ تمہارے اندر بھی آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو۔(۱) تو یہاں فرمایا جا رہا

(۱) اس ضمن میں یہ حدیث نبوی بھی بہت پیاری اور سبق آموز ہے کہ: "اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْهِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْهُ" (متفق علیہ) یعنی ''جب تم میں سے کسی کی نظر ایسے شخص پر پڑے جس پر اللہ کا فضل مال اور جسم میں تم سے زیادہ ہوا ہے تو اسے چاہئے کہ ایسے شخص کو بھی دیکھے جو (ان چیزوں میں) اس سے نیچے ہو''۔

ہے ''اس جنت کے حصول کے لئے دوڑ لگاؤ جس کا پھیلاؤ' جس کی پہنائی آسمان اور زمین جتنی ہے''۔ یہی مضمون سورۃ آل عمران میں ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ﴾(آیت ۱۳۳) ''دوڑو اپنے ربّ کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے''۔

ان دونوں آیات میں لفظ ''عرض'' آیا ہے' اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اردو زبان میں ہم عرض' طول کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں اور عرض کم ہوتا ہے اور طول زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں ''عرض'' کسی شے کی مجرد وسعت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر الفاظ آئے ہیں: ﴿ذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ ﴾ ''لمبی لمبی دعائیں کرنے والا''۔ (حم السجدۃ:۵۱) یعنی جب انسان کو کوئی تکلیف آتی ہے تو بڑی لمبی چوڑی دعائیں مانگنا شروع کر دیتا ہے اور جب ہماری طرف سے نعمت مل جاتی ہے تو ہمیں بھول جاتا ہے' اسے یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ کبھی وہ اپنے پروردگار کو پکارتا بھی تھا' کبھی اس سے دعائیں بھی کرتا تھا۔ تو آدمی جب احتیاج میں ہوتا ہے تو اللہ کو پکارتا ہے۔ تو یہاں عرض سے پھیلاؤ مراد ہے کہ تم جنت کا تصور کر ہی نہیں سکتے۔ قرآن مجید سائنس اور فلسفے کی اصطلاحات استعمال نہیں کرتا' بلکہ عام انسانی ذہن کی سطح کے برابر آ کر بات کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں قرآن نے کائنات کی وسعت کے لئے بھی آسمان اور زمین کے الفاظ استعمال کئے ہیں' اس لئے کہ کائنات کے بارے میں ہمارا کل تصور یہی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جنت کتنی بڑی ہوگی تم اس کا تصور نہیں کر سکتے' تمہارا تو اپنا ذہن بھی بہت مختصر ہے۔ آج کے ترقی یافتہ اور سائنسی دور کے انسان کو بھی ابھی کچھ پتا نہیں کہ یہ کائنات کتنی طویل و عریض ہے' کہاں سے شروع ہو رہی ہے اور کہاں ختم ہو رہی ہے۔ ٹیلی سکوپ جتنی بڑی ہوتی جا رہی ہے کائنات بھی اتنی ہی مزید پھیلتی نظر آ رہی ہے۔ بہرحال کسی ٹیلی سکوپ نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس جگہ پر کائنات ختم ہوتی ہے اور وہاں تک ہماری رسائی ہوگئی ہے۔ تو

اس اعتبار سے قرآن مجید وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جسے عرب کا عام بدو بھی سمجھ لے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کہ اس جنت کی پہنائی اور وسعت تم کیا سمجھو گے؟ بس یوں سمجھو آسمانوں اور زمین جتنی۔

دخولِ جنت کے لئے کیسا ایمان درکار ہے؟

آگے فرمایا: ﴿اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ ''یہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اللہ پر اور ان کے رسولوں پر''۔ اَعَدَّ (باب افعال) کسی شے کو اہتمام کے ساتھ تیار کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ جنت فراہم کی گئی ہے' تیار کی گئی ہے' سنواری گئی ہے' پورے طریقے سے اس کو بنایا گیا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اب یہاں نوٹ کر لیجئے کہ سورۃ الحدید کی اس آیت میں بھی اور انیسویں آیت میں بھی ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے آگے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ انیسویں آیت میں سلوکِ قرآنی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر' وہی صدیقین ہیں''۔ اس میں نہ تو انفاق کا تذکرہ ہے' نہ قتال کا اور نہ ہی اعمالِ صالحہ کا۔ لیکن مراد یہ ہے کہ جب واقعتاً حقیقی معنی میں ایمان موجود ہو گا تو یہ اعمال بھی لازماً موجود ہوں گے۔ یہ گویا کہ از خود وہاں پر مندرَج ہیں' understood ہیں۔ اس ایمان کے ساتھ انفاق بھی ہو گا' جہاد بھی ہو گا' قتال بھی ہو گا' اعمالِ صالحہ بھی ہوں گے' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ یہ سب کچھ ہوں گے۔ لہٰذا یہاں پر یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ مجرد ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ تو یہاں مراد یہ ہے کہ یہ جنت تیار کی گئی ہے' اس کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر حقیقتاً ایمان رکھنے والے ہوں گے۔

محض اعمال کی بنیاد پر جنت میں داخلہ ممکن نہیں

آگے ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے گا دے گا''۔ ''فضل'' سے مراد ہے اللہ کی طرف سے بغیر استحقاق کے

دی جانے والی شے۔ اس کے بالمقابل اجرت اور اجر کے الفاظ عام استعمال ہوتے ہیں جو باہم مترادفات ہیں اور ان کا مطلب ہے بدلہ' جو کسی محنت اور مزدوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جہاں بھی جنت کا تذکرہ آیا ہے وہاں ''فضل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ گویا قرآن مجید کا تصور یہی ہے کہ انسان مجرد اپنے عمل کے ذریعے سے جنت کا مستحق نہیں بن سکتا' جب تک کہ فضل خداوندی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس بارے میں ایک بڑی پیاری حدیث ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَنْ یُّدْخِلَ اَحَدًا مِّنْکُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ)) قَالُوْا : وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ مِنْهُ بِفَضْلٍ وَّرَحْمَةٍ)) (1)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کا عمل بھی اسے جنت میں داخل نہیں کر سکے گا''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیا آپ کو بھی نہیں یارسول اللہ ﷺ؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں مجھے بھی نہیں' اِلا یہ کہ مجھے اللہ اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے''۔

اللہ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے گا تو جنت میں میرا داخلہ ہوگا۔ یہ ایک اضافی بات ہے جو حضور ﷺ نے اپنے بارے میں بھی فرمادی' لیکن دراصل بات یہ سمجھانی مقصود ہے کہ کبھی بھی جنت کو اپنا استحقاق نہ سمجھئے' اپنی امکانی حد تک کام کر کے پھر بھی فضل خداوندی کا ہی سہارا لیجئے۔ قرآن مجید میں اہل جنت کا ترانہ نقل ہوا ہے' جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ﴾ (الاعراف:۴۳) ''اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے' اور ہم یہاں نہ پہنچ پاتے اگر اللہ ہی ہمیں نہ پہنچاتا''۔ تو لفظ ''فضل'' کے حوالے سے اس بات کو نوٹ کر لینا چاہئے۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾ ''اللہ بہت بڑے فضل کا مالک ہے''۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب المرضی' باب تمنی المریض الموت۔ وصحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب لن یدخل احد الجنة بل برحمة الله تعالٰی۔

ہر مصیبت اللہ کی جانب سے ہے

اب اگلی آیات میں جو مضمون آ رہا ہے یہ اس سے پہلے سورۃ التغابن میں بڑی وضاحت سے آ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ لفظاً زیادہ تفصیل ہے لیکن وہاں کم الفاظ میں معناً یہ بات آ چکی ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں انسان مختلف حوادث اور آفاتِ ارضی و سماوی سے بہت متاثر ہوتا ہے جو بسا اوقات بڑے پیمانے پر آ جاتی ہیں۔ کبھی زلزلہ آ جاتا ہے تو ہزاروں انسان اس میں ختم ہو جاتے ہیں' مکانات دھنس جاتے ہیں' یا سیلاب آتا ہے تو بڑے پیمانے پر لوگ ڈوب جاتے ہیں' ان کے گھر ختم ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے رقبے پر کھڑی فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں' یا انسان کے اپنے اندر بیٹھے بٹھائے اچانک کوئی بیماری جنم لے لیتی ہے جبکہ اسے اس کا کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ کینسر ہے یا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی شریانیں اتنے فیصد blocked ہیں۔ بعض اوقات انسان بیٹھے بٹھائے کسی مقدمے میں پھنس جاتا ہے۔ اب ان چیزوں کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی نازل ہونے والی زمین میں اور نہ تمہارے اپنے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں''۔ یہاں پر لفظ ''مُصِیْبَة'' کی لغوی تشریح سمجھ لیجئے! اَصَابَ' یُصِیْبُ (آ پڑنا' نازل ہونا) سے اسم الفاعل مُصِیْب ہے اور اس کی مؤنث مُصِیْبَة ہے' جس کے معنی ہیں نازل ہونے والی شے' آ پڑنے والی شے۔ یعنی جو بھی کوئی کیفیت آپ پر یا مجھ پر وارد ہوتی ہے' چاہے وہ اچھی ہو چاہے بری ہو' چاہے تکلیف دہ ہو' چاہے مسرت بخش ہو اُس پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ گویا جہاں تک اس لفظ کا لغوی تعلق ہے تمام حوادث' واقعات' کیفیات جو ہم پر وارد ہوتی ہیں' وہ سب کی سب اس میں شامل ہو جائیں گی' لیکن عام طور پر یہ لفظ تکلیف دہ' ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں ﴿فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ کے الفاظ لا کر مصائب کی

بھی تقسیم کردی گئی ہے۔ مصیبتیں دو قسم کی ہیں۔ یا تو سماوی یا آفاقی مصیبتیں ہیں جو زمین پر بڑے پیمانے پر نازل ہوتی ہیں یا انسان کی اپنی جانوں میں کوئی مصیبت آن پڑتی ہے' مثلاً کوئی بیماری یا کوئی اور عارضہ لاحق ہو گیا ہے' آدمی کا کوئی عضو کٹ گیا ہے یا کوئی اور حادثہ پیش آ گیا ہے۔ تو فرمایا: ﴿اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط﴾ ''مگر وہ ایک کتاب میں درج ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں' اس کو وجود میں لائیں' اس کو خلعتِ وجود سے سرفراز کریں۔

تخلیق اور ظہورِ تخلیق کا فرق

اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں فلسفۂ وجود سے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے' البتہ اس آیت میں وارد لفظ ''نَبْرَاَ'' کے حوالے سے بات سمجھ لینی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اسم گرامی ''البارئ'' ہے' جیسے کہ سورۃ الحشر کی آخری آیت میں اسماءِ حسنیٰ بیان ہوئے: ﴿ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾ ''باریٔ'' کے مفہوم کو سمجھنے سے پہلے لفظ ''خالق'' کو سمجھ لینا چاہئے۔ عام طور پر جب لفظ ''خالق'' کے ساتھ لفظ ''باریٔ'' آتا ہے تو اکثر لوگوں نے اس کا یہ نقشہ پیش کیا ہے کہ خلق کہتے ہیں ذہنی طور پر کسی شے کی منصوبہ بندی اور نقشہ بندی کرنے کو اور بَرا کا مطلب ہے اُس شے کو ایک ظاہری شکل عطا کر دینا۔ ہماری انسانی تخلیق میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ کوئی مصور پہلے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بناتا ہے' پھر اسے صفحۂ قرطاس یا کینوس پر لاتا ہے۔ کوئی موجد ہے تو اس کے ذہن میں بھی پہلے اس ایجاد کا تصور آتا ہے' پھر عملاً یہ شے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ باریٔ کے لفظ میں اصولی طور پر یہ بات موجود ہے۔ بَرِءَ ' یَبْرَءُ کا لغوی معنی ہے کسی شے سے علیحدہ ہو جانا۔ اسی سے براءت اور تبرّا وغیرہ الفاظ بنے ہیں جن کا یہی مطلب ہے کہ علیحدہ ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بارے میں بھی فلاسفہ نے یہی دو مراحل بیان کئے ہیں کہ ایک ہے کسی شے کا وجودِ علمی جو اللہ کی ہستی اور اس کے علم میں تھا' وہ شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں تھی' بس اس کا خارجی وجود نہیں تھا۔ اب وہ خارجی طور پر وجود میں آتی ہے تو یہ ہے بَرِءَ ' یَبْرَءُ اور اس کے حوالے سے

اللہ تعالیٰ اَلْبَارِیُٔ ہے۔ جو بھی حوادث اس کائنات میں آنے والے ہیں علم خداوندی میں تو پہلے سے موجود ہیں۔ وہ ''عَالِمُ مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' ہے۔ جو ہوا ہے اور جو ہونا ہے سب اس کے علم میں ہے۔ تو جہاں تک کسی شے کے وجودِ علمی کا تعلق ہے تو ہر شے ہمیشہ سے اللہ کے علم میں ہے۔ جیسے اللہ کی ذات قدیم ہے ایسے ہی اس کی صفات اور اس کا علم بھی قدیم ہے۔ ہر شے کا ایک وجودِ علمی اللہ کی ذات کے ساتھ پہلے سے قائم تھا۔ اس کو کہا گیا: ﴿اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ﴾ کتاب سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا علم۔ تو اللہ کے علم میں وہ شے پہلے سے موجود تھی۔ آگے الفاظ آ رہے ہیں: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ ''اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں''۔ اب گویا کہ وہ شے وجودِ علمی سے وجودِ خارجی میں منتقل ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال کا ایک بہت اونچا شعر ہے' البتہ اس پر بہت زیادہ قیاس نہ کیجئے گا۔ فرمایا:

بضمیرت آرمیدم تو بہ جوشِ خود نمائی
بہ کنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را!

یعنی اے اللہ! میں تو تیرے وجود کے اندر بڑے آرام سے تھا۔ یعنی علامہ اقبال جو ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یا اس سے بھی نو مہینے پہلے ان کی والدہ محترمہ کے رحم کے اندر ان کا جو استقرارِ حمل ہوا اس سے لاکھوں کروڑوں سال پہلے بھی تو ان کا وجود اللہ کے علم میں تھا' تو اس اعتبار سے وہ کہہ رہے ہیں کہ میں تیرے وجود کے اندر یعنی تیرے علم میں بڑے آرام میں تھا۔ مجھے تو کوئی چِنتا' کوئی تشویش' کوئی فکر نہیں تھی' تو نے خود ہی اپنی خلاّقی کے ظہور کے لئے مجھے اپنے وجود سے باہر کیا۔

یہاں علامہ اقبال بڑی پیاری تمثیل لائے ہیں کہ سیپی کے اندر موتی پروان چڑھ رہا ہوتا ہے' جب موتی بن جاتا ہے تو سیپی از خود کھلتی ہے اور موتی کو باہر پھینک دیتی ہے۔ گویا کہ اس کے وجود میں جو قیمتی شے پروان چڑھ رہی تھی وہ تو ظہور چاہتی ہے' اگر سیپی کے اندر ہی وہ موتی گم رہے تو ظاہر بات ہے اس کا حسن کس نے دیکھا۔ جنگل میں

مورنا چا کس نے دیکھا! اس سیپی کے اندر اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی موتی پڑا ہوا ہے تو اسے کس نے دیکھا! کون اس کے حسن کی تعریف کرے گا؟ تو سیپی خود کھلتی ہے اور اس میں سے وہ موتی باہر نکلتا ہے جس کو پھر ہمارے غوّاص (غوطہ خور) سمندر کی تہہ سے نکال لاتے ہیں۔ تو اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہیں کہ تو نے خود ہی سیپی کی طرح مجھے اپنے وجود سے باہر کیا' یعنی مجھے یہ مادی وجود عطا کیا جو اس وقت میں علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ولد شیخ نور محمد کے نام سے دنیا میں ہوں۔ اصل میں اقبال یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلاقی کے ظہور کے لئے اس کائنات کو پیدا کیا۔ تو اس پورے فلسفے کو سمجھ لینے سے لفظ بَرَءَ کے حوالے سے یہ پوری حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بدقسمتی سے ان چیزوں پر غور کا حق ادا نہیں کیا گیا۔

﴿ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴾ ''یہ چیز اللہ کے لئے بڑی آسان ہے''۔ یہ تمہیں تو بڑی مشکل بات معلوم ہو گی کہ یہ ساری چیزیں ہی کسی کے علم میں موجود ہوں' لیکن یہ اللہ کی بات ہو رہی ہے۔ تم جس طرح اللہ کے وجود اور ذات کو نہیں سمجھ سکتے اسی طرح اس کی صفات کی کیفیت اور کمیت کو بھی نہیں جان سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت اور کمیت دونوں ہمارے احاطۂ ذہنی سے خارج ہیں۔

ہر حال میں مطلوب طرزِ عمل — تسلیم و رضا

آگے فرمایا: ﴿ لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ ﴾ ''تا کہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے''۔ اللہ کی طرف سے جو حوادث سامنے آتے ہیں وہ امتحان کے لئے ہیں۔ تکلیف آ جائے تو صبر کرو' اللہ کچھ دے دے تو اس کا شکر کرو۔ فوت ہو جانا اردو میں بھی مستعمل ہے۔ یہاں فوت ہونا اس معنی میں ہے کہ کوئی موقع تھا جو ہاتھ سے نکل گیا' کوئی اور شے تھی جو آپ کے ہاتھ سے جاتی رہی' آپ کا کوئی عزیز فوت ہو گیا' آپ کا کوئی بچہ آپ کے سامنے دم توڑ رہا ہے اور آپ بہرحال اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ سورۃ الواقعۃ میں ارشاد ہوا: ﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴾ ''اور ہم تمہاری نسبت اس (فوت ہونے والے) کے زیادہ قریب

ہوتے ہیں مگر تم دیکھ نہیں پاتے"۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہم تمہارے محبوبوں کو لے جاتے ہیں اور تم کچھ نہیں کر سکتے' بس دیکھ رہے ہوتے ہو۔ تو کوئی شخص یا چیز فوت ہو جائے تو اس پر بھی افسوس نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ وہ شے گئی کہاں ہے؟ اسی کائنات میں ہے۔ بس اس کی حالت تبدیل ہوئی ہے اور اللہ نے تمہارے امتحان کے لئے ایک صورت پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ﴾ "اور جو کچھ اللہ دے دے اس پر اترایا مت کرو"۔ اس لئے کہ یہ بھی امتحان کے لئے ہی ہے' یہ بھی بغرضِ آزمائش ہے۔ اگر اس نے تمہیں دولت دی ہے تو اس کا حساب بھی تو تمہیں دینا ہوگا۔ جس کے پاس دولت زیادہ ہے اس کا حساب بھی بہت بھاری ہو جائے گا۔ جیسے دولت مندوں کو انکم ٹیکس کی زیادہ فکر ہوتی ہے' جو شخص hand to mouth ہے اس سے انکم ٹیکس کے کسی افسر کو کیا سروکار! تو وہاں جب حساب دینا ہوگا تو پتہ چلے گا کہ ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہے۔ اسی لئے بیلنس شیٹ جب بنتی ہے تو سرمائے کو liabilities کے کھاتے میں ڈالتے ہیں کہ تمہیں اس کا حساب دینا ہے کہ اسے کن کن مدّات میں خرچ کیا اور اس کے ذریعے کمایا کیا؟ اس حوالے سے ایک بہت پیاری حدیث ہے جس میں پانچ سوالوں کا تذکرہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْاَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَ اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ اَبْلَاهُ وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيْمَ اَنْفَقَهُ وَمَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ؟))(۱)

"ابنِ آدم کے قدم قیامت کے روز اپنے ربّ کے حضور ہرگز نہیں ہل سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے: اس کی عمر کے بارے میں کہ کن کاموں میں کھپائی' اور (خاص طور پر) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کن کاموں میں گلائی اور اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کن جگہوں پر خرچ کیا' اور یہ کہ علم کے مطابق کتنا عمل کیا۔"

تو معلوم ہوا کہ جو چیز اللہ دے دے اس پر اِتراؤ مت! اور جو اللہ چھین لے اس پر غم و

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفة القيامة والرقائق والورع' باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص

افسوس نہ کرو! مؤمن کی کیفیت تو وہ ہونی چاہئے جیسے سورۃ التغابن میں بیان کیا گیا ہے: ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ﴾ ''نہیں آن پڑتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے حکم سے' اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔'' یعنی تسلیم و رضا کی ہدایت کہ اللہ کی مرضی یہی تھی' اللہ کا فیصلہ یہی تھا۔ مؤمن مطمئن رہتا ہے کہ اسی میں میرے لئے خیر ہوگا' چاہے وہ خیر مجھے نظر آئے یا نہ آئے!

(نوٹ: اس آیت پر گفتگو اگلی نشست میں جاری رہے گی)

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظيم ونفعنی واياكم بالآيات والذكر الحكيم

القاسم اکیڈمی کی عظیم تاریخی اور انقلابی پیشکش

اکیسویں صدی کی پہلی جنگ' معرکہ صلیب و طالبان

صلیبی دہشت گردی اور عالم اسلام

طالبانِ افغانستان کے تناظر میں

جہادِ افغانستان' تحریکِ طالبان' ملا محمد عمر' اسامہ بن لادن' جہاد اور دہشت گردی' نظامِ شریعت سے مغرب کا بے جا خوف' دینی مدارس بالخصوص دار العلوم حقانیہ' اسلام کے بارے میں مغرب کی لاعلمی اور غلط فہمیاں' امریکی اور مغربی دنیا کے عزائم اور مسلم امۃ پر جارحانہ یلغار' سقوط بغداد' مسئلہ فلسطین و کشمیر اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت جیسے اہم و حساس قومی و بین الاقوامی موضوعات کے تناظر میں عالمی اور مغربی میڈیا سے

مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ کا دوٹوک مکالمہ

مرتب: مولانا عبد القیوم حقانی

صفحات: 520 قیمت: 240 روپے

القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' خالق آباد' ضلع نوشہرہ' سرحد پاکستان